معاشرتی ارتقاء اور فقہی مسائل پر اسکے اثرات

مولانا مفتی غلام الرحمٰن مہتمم جامعہ عثمانیہ پشاور

الحمد لله و كفى وسلام على عباده الذين اصطفى. امابعد

انسانی معاشرہ کا تفاوت اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ حالات کی تبدیلی نا قابل انکار حقیقت ہے یہ ضروری نہیں کہ کسی معاشرے یا سوسائٹی کا وجود صوبوں تک محفوظ رہے آج کل سائنسی دور میں معاشرہ کی تبدیلی تو سالوں کی بات ہے چند سال گزرنے سے حالات ایسی تبدیلی کے شکار ہوتے ہیں کہ قریبی وقت کے واقعات ایام ماضیہ کی تاریخی حیثیت اختیار کر جاتے ہیں۔

معاشرتی حالات کی تبدیلی سے مسائل کا پیدا ہونا لازمی امر ہے ہم دیکھتے ہیں کہ جدید دور کے نت نئے مسائل کا گذشتہ اوقات میں تصور بھی نہیں تھا بلکہ آئندہ "**ویخلق مالا تعلمون**" کی ایجادات ابھی تصورات کے دائرہ سے خارج ہیں حالات کی اس تبدیلی سے تعبیر اگر "عرف" اور "عادت" سے ہو تو شاید مسائل سے آگاہی کے لئے زیادہ معاون اور ممد ثابت ہو۔

عقلاء اور دانشوروں کی رائے ہے کہ رہن سہن خورد ونوش اور باہمی تعلقات کی شکلیں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔ حالات کی یہ تبدیلی فطری عمل ہے کیونکہ ضروریات ہمیشہ ایک نہیں رہتیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ تبدیلی کا یہ عمل درحقیقت ان مسائل کی پیداوار ہے جو کنبے گھرانے یا خاص علاقے میں ترویج پاتے ہیں اس تبدیلی سے انسانی معاشرہ ایسا مانوس ہو جاتا ہے کہ تبدیلی کا قدم کسی ہچکچاہٹ کے بغیر آسانی سے قبول کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ عرف اور رواج سے پانے والے واقعات سے انسان کا کٹ جانا بڑا شاق ہوتا ہے مشکل ذمہداریوں کا نبھانا انسان کے لئے محض اور رواج سے پانے والے واقعات سے انسان کا کٹ جانا بڑا شاق ہوتا ہے مشکل ذمہ داریوں کا نبھانا انسان کے لئے محض عرف اور عادات کیوجہ سے روزمرہ کا معمول بن جاتا ہے عقل سلیم خود اس کے قبول کرنے پر آمادہ ہوتی ہے۔ علامہ ابن عابدین عرف کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

العرف والعادة مااستقر فی النفوس من جهة العقول والتقه الطباع السليمة بالقبول. (شرح عقود رسم المفتی/ ۹۴)

عرف کی شرعی حیثیت:۔

عرف کے مانوس ہونے اور انسانی فطرت کا آسانی سے قبول کرنے کی وجہ سے شریعت نے اس کو ایک اہم مقام دیا ہے اس

کی حیثیت کو تسلیم کر کے بعض اوقات میں مسائل کے جواز اور عدم جواز میں اس کو بنیادی کردار ادا کرنے کا حق دیا ہے ہم دیکھتے ہیں کہ حالات کی تبدیلی کا اگر یہی معیار رہا اور غالب گمان ہے کہ اس سے بڑھ کر بھی حالات بدل سکتے ہیں تو پھر اس کو اعتبار نہ دینے سے ایسی پیچیدگیاں پیدا ہو سکتی ہیں کہ شریعت پر عمل کرنا وقت کا سنگین مسئلہ بن سکتا ہے۔

صحابہ کرام کا زمانہ خیر القرون کا دور ہے۔ دور نبویؐ سے یہ مرحلہ کچھ اتنا دور نہیں تھا۔ پھر بھی جب حالات کی تبدیلی آئی تو صحابہ کرام نے عرف کو اعتبار دینا مسائل کا حل سمجھا خلفاء راشدین کے دور میں منکرین زکوٰۃ سے جہاد کرنے کے لئے سیدنا ابوبکر صدیقؓ کے موقف کو عرف اور حالات کی تبدیلی سے تائید ملی ایسا ہی جنگ یمامہ میں نامور قراء اور حفاظ کی شہادت کے واقعات نے مسلمانوں کو جمع قرآن کی طرف متوجہ کیا چنانچہ حضرت عمرؓ حالات کی تبدیلی کو منشا اور بنیاد بنا کر جمع قرآن کی رائے دی۔ امام ترمذی کی روایت میں ہے۔

ان القتل قداستحر بقراء القرآن یوم الیمامه وانی لاخشی ان استحر لتقل القراء فی المواطن کلها فیذهب قرآن کثیر وانی اری ان تامر بجمع القرآن. (ترمذی ابواب التفسیر)

حالات کی تبدیلی ایسے وقت رونما ہوئی تھی کہ رسول اللہ ﷺ کی محفل و مجلس کے فیض یافتہ شخصیات ابھی بقید حیات تھے ان کی نظر میں دور نبویؐ کا سنہری زمانہ محفوظ تھا۔ حالات کی تبدیلی سے مسائل کا متاثر ہونا ان کو قطعاً گوارا نہ تھا چنانچہ حضرت زید بن ثابتؓ کو جب جمع قرآن کی یہ ذمہ داری سونپی گئی تو آپؓ نے دوٹوک اعلان کیا۔

کیف تفعلون شیألم یفعله رسول الله صلی الله علیه وسلم (ایضا) لیکن عرف اور حالات کی تبدیلی سے مجبور ہو کر آخر کار صحابہ کرامؓ قرآن مجید جمع کرنے پر آمادہ ہوئے اگر چہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں اس کا ایسا وجود نہیں تھا۔

اس کے علاوہ حضرت عمرؓ کا دور ایسے نظائر سے بھرا پڑا ہے۔ بلکہ آپ کے دور خلافت میں جب اسلام کی سلطنت میں وسعت پیدا ہوئی۔ اسلامی ثقافت عربوں کے علاوہ عجمیوں پر چھا گئی تو اس نے بے شمار مسائل جنم دیئے جن کو عرف کی روشنی میں حل کیا گیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جب مسائل کی کثرت ہوئی تو فقہاء کرام نے اپنے اپنے زاویہ خیال یا مکتبہ فکر کے مقررہ اصول کی روشنی میں حل کیا گیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جب مسائل کی کثرت ہوئی تو فقہاء کرام نے اپنے اپنے زاویہ خیال مکتبہ فکر کے مقررہ اصول کی روشنی میں طریقہ کار کا تعین کیا چنانچہ ظواہر کا نقطہ نظر اگر چہ کتاب اللہ سنت رسولؐ اور اجماع کے ظاہری نصوص تک محدود رہا لیکن اصحاب رائے یعنی مجتہدین نے حالات کا گہری نظر سے مطالعہ کر کے الگ الگ نظریئے پیش کئے۔ شوافع نے ان تین کے علاوہ قیاس اور استصحاب الحال کی ضرورت بھی محسوس کی حنابلہ نے المصالح المرسلہ اور الذرائع کے نام سے الگ اصطلاحات واضح کئے جبکہ احناف نے مسئلہ کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے استحسان اور عرف میں ان نئے مسائل کا حل ڈھونڈا۔

عرف سے مسائل کی تبدیلی کے اثرات:۔

عرف کیوجہ سے کئی نا قابل حل مسائل کو قابل عمل بنایا گیا ہم دیکھتے ہیں کہ بسا اوقات عرف کی تبدیلی حکم کے تغیر کا ذریعہ بنتی ہے چنانچہ ابن عابد بن فرماتے ہیں۔

فالعرف فی الشرع له اعتبار : لذاعلیه الحکم قدیدار

معاشرہ اور عرف کیوجہ سے جیسا کہ الفاظ کے حقیقی معانی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے ایسا ہی مسائل کی تبدیلی بھی ناگزیر ہوتی ہے حضرت امام ابوحنیفہؒ سے کسی مسئلہ میں دوٹوک موقف اختیار کرنے کے باوجود عرف ہی کی وجہ سے تلامذہ کو اختلاف کرنے کی جرات ہوتی ہے اور یہ اختلاف بسا اوقات ایسی سنگین صورت حال اختیار کر لیتا ہے کہ شیخ پر اعتماد اور حسن ظن کے باوجود محض عرف کی وجہ سے تلامذہ کے قول سے ترجیحی سلوک کرنا پڑتا ہے۔ آخر کار، مزارعت، اجرت علی الامامہ وتعلیم القرآن، گواہ کی ظاہری حالت پر قناعت نہ کرنے کی صورت میں خفیہ معلومات، بادشاہ کے علاوہ کسی دوسرے سے اکراہ کے تحقق اجیر مشترک کو اشیاء کی ہلاکت کا ضامن ٹھہرانا اور عقار میں غصب کو اعتبار دینے میں آخر کار کونسا عامل ہے۔ جس کی وجہ سے امام ابوحنیفہؒ کی بجائے صاحبین کے قول پر فتوی دینا پڑا میرے خیال میں متقدمین کے فتاوی اور فرمودات میں کوئی ابہام موجود نہیں تھا لیکن اس کے باوجود تلامذہ کے قول کو ترجیح دینے میں بنیادی کردار عرف کا رہا ہے۔

عرف کا دائرہ کار:۔

عرف کا اعتبار دینے سے یہ غلط فہمی نہ رہے کہ پھر معاشرہ کا کونسا نا قابل حل مسئلہ ہے جو عرف کے دائرہ کار سے خارج ہو پھر تو سود جوا اور دیگر مروجہ غیر شرعی احکام کو بھی سہارا مل سکتا ہے۔ حالانکہ اس کا کوئی قائل نہیں بلکہ اس سے شریعت کی پوری شکل بگڑ سکتی ہے آج ہمارے معاشرے کے بعض سادہ لوح یا مذہب وعقیدہ سے ناواقف لوگ مجتہدین کی فیکٹریاں لگانا چاہتے ہیں جن سے ایسے سکالروں اور محققین کی توقع رکھتے ہیں جو شریعت کو وقت کا تابع بنا کر رکھیں۔ عرف کو اعتبار دینے میں یہ بنیادی شرط ہے کہ عرف ایسا نہ ہو جو کسی منصوص حکم سے متصادم ہو ورنہ جہاں ایسا عرف ہو جس سے حکم شرعی معطل ہوتا ہو یا کسی ظاہری اور محکم نص کو چھوڑنے پر منتج ہو تو ایسے عرف کو اعتبار نہیں دیا جائے گا اس لئے شریعت مطہرہ کے ظاہری اور محکم نصوص پر کاربند رہنا ہوگا تاہم عرف کیوجہ سے کسی حکم میں تخصیص کا ہونا نا قابل فہم اور ممکن العمل ہے۔

موجودہ حالات کے بعض قابل توجہ مسائل:۔

تجارتی میدان پر یہودیوں کے قبضہ اور غیر مسلم لوگوں کے بعض امور میں سبقت سے ہمارا اسلامی معاشرہ چند مشکلات سے دو چار ہے کمپیوٹر کی دنیا میں حیرت انگیز تبدیلی سے مسئلہ مزید پیچیدگی کا شکار ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ایک نہیں دو نہیں بلکہ بے شمار مسائل آج

مسلمان علماء اور زعماء سے حل کے خواہاں ہیں۔ یوں تو ہماری سوسائٹی ایسی المناک واقعات سے بھری پڑی ہے لیکن پھر بھی چند میدانوں میں مسائل کا احساس زیادہ ہے جن میں چند مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) معاشی میدان:۔

یہ موجودہ دور کا معرکۃ الاراء مسئلہ ہے یہودیوں کا اقتصادی میدان پر قابض ہونے کی وجہ سے یہ میدان کئی مشکلات سے دو چار ہے معاشرہ میں رہتے ہوئے معمولی غفلت سود خوری اور حرام کی آمدنی کا ذریعہ بن جاتی ہے سود خوری سے لوگوں کی قوت تمیز اس درجہ متاثر ہوئی ہے کہ حرام وحلال کی تمیز لوگ اضافی بوجھ سمجھتے ہیں۔ پھر بینک کاری نظام کی کامیابی کے دعوؤں سے علماء کے کندھوں پر مزید بوجھ پڑتا ہے اور یہ وقت کا بڑا چیلنج ہے درحقیقت اولاً ہمارے علماء بینک کاری نظام سے ناواقف ہوتے ہیں وہ صرف سودی کاروبار کے نام سے جانتے ہیں جس کے لئے حرام یا ناجائز کی اصطلاح وضع ہے لیکن اس کے مقابلہ کے لئے ہمارے پاس متبادل نظام کیا ہے؟ شاید مضاربت مشارکت کے عقد ہم سمجھیں لیکن اس پر بھی محنت کر کے معاشرہ میں قابل عمل ہونے کی گارنٹی دینا کسی عالم کے دائرہ کار میں نہیں۔ علاوہ ازیں خرید وفروخت کی جدید شکلیں بین الاقوامی تجارت اور مختلف ناموں سے کئی جاری سکیمیں قابل توجہ ہیں۔

طبی میدان:۔

دوسرا اہم میدان فن طب کے محیر العقول کارنامے ہیں کچھ مدت قبل تک انسانی اعضاء کی پیوند کاری یا تبدیلی خون علماء کے لیے چیلنج بنا ہوا تھا ابھی شکم مادر میں بچے کی بیماریوں کا پتہ لگا کر اس کا علاج کرنا اور علم ومعرفت دل ودماغ کی تبدیلی کے لئے ماہرین پر تول رہے ہیں ممکن ہے اس سوچنے پر مجبور ہوں کہ تحصیل علم کے لئے اتنی محنت کی ضرورت کیا ہے کسی نامور ماہر کے دماغ سے قوت خزانہ کو نکال کر دوسرے کے سر میں فٹ کر کے بلا محنت سکالر بن سکتا ہے ایسے کئی مسائل ہیں جو اس میدان میں درپیش ہیں۔ شرعی احکام سے اس کی وابستگی اس سے شرعی حکم کا تقاضا کرتے ہیں۔

نئی دنیا کی تلاش:۔

سائنس دان چاند پر تسخیر کی کامیابی کے بعد دوسرے سیاروں کے بارے میں سوچ رہے ہیں خلائی اسفار اور سٹیشن کے قیام سے پھر مدتوں تک خلاء میں رہنے سے اس کے شرعی ذمہ داریوں کی نوعیت کے بارے میں بڑے غور وحوض کی ضرورت ہے صرف اس سے جان نہیں چھوٹتی کہ سجدہ کی تعریف "وضع الجبهه على الارض" کر کے خلائی سفر میں اس کو جائز ناجائز قرار دیں۔ اس کے علاوہ بھی تقاضوں کی تبدیلی سے احکام کا متاثر ہونا لازمی امر ہے۔

علماء کی ذمہ داریاں:۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جدید مسائل علماء کے لئے بڑا چیلنج ہیں ہمارے علماء کے لئے بڑے سے بڑا مسئلہ ضروریات سے

ناواقفیت ہے یعنی اولاً تو ہم ان مسائل سے نابلد ہیں جو مسائل تحقیق چاہتے ہیں پھر اگر مسئلہ سمجھیں تو اس کا حل کرنا امتحان سے کم نہیں ایسی حالت میں کسی مسئلہ کے بارے میں ناجائز اور حرام کا فتوی لگانا کافی نہیں اور نہ اس سے ذمہ فارغ ہو جاتا ہے بلکہ معاشرہ کی ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے متبادل نظام متعارف کرانا بھی ہماری ذمہ داری ہے متبادل نظام سے مراد صرف جزئیہ کا حوالہ نہیں بلکہ قابل عمل حل پیش کرنا مراد ہے آج دین کی وجہ سے علماء کی عزت ہے یہ ہم سے تقاضا کرتی ہے کہ اس میدان کو خالی نہ چھوڑیں خدانخواستہ اگر غفلت آمیز رویہ اختیار کیا گیا تو تاریخ معاف نہیں کرے گی بلکہ مسائل کے حل تلاش نہ کرنا اور اس سے لاپرواہی اختیار کرنا دینی اقدار پائمال کرنے اور خود اپنی زبان سے اسلام کے تہذیب کی تکذیب ہے۔

تجاویز:۔

یہ تو ہمیں احساس ہے کہ میدان میں بڑی محنت کی ضرورت ہے علماء کی ذمہ داریاں بڑھ گئی ہیں یہ کسی انتھک جدوجہد کے بغیر ممکن نہیں لیکن اس کا طریقہ کار کیا ہے؟ میرے ذہن میں اس پر کام کرنے کے لیے دو راستے ہیں۔

(۱) ہنگامی بنیاد پر کام کرنا:۔

ہنگامی بنیاد پر کام کرنے سے مراد یہ ہے کہ فی الحال ایسی جماعت کے بارے میں سوچا جائے کہ وہ چند سال محنت کر کے کام کر سکے مثلاً وفاق المدارس کی سطح پر جو طلبہ درجہ عالیہ سے فارغ ہوں ان میں ایسے طلبہ کا انتخاب کیا جائے جن کی علمی رسوخ کے ساتھ عصری علوم پر گہری نظر ہو مثلاً وہ طلبہ بی اے، ایم اے کر چکے ہوں یا کم از کم ایف، ایف ایس سی ہوں ان کے لئے ایسا ادارہ بنایا جائے جس میں چار پانچ سالوں میں ان کی تربیت ہو لیکن اس کے ساتھ ضروری ہوگا کہ ان طلبہ کو معقول وظیفہ بھی دیا جائے تاکہ مالی مشکلات ان کی علمی ترقی کے لیے مانع نہ بنیں اور یکسوئی سے محنت پر توجہ دیں تاہم انکے انتخاب میں اس کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ کہیں یہ طلبہ دین کے نام پر محنت کر کے کل دنیا کمانے والے نہ بنیں۔ ایسے طلبہ ہوں جو اللہ تعالیٰ کے دین کا کام اپنی ذمہ داری سمجھ کر کریں ممکن ہے چند سالوں میں اس سے ہمیں اساتذہ کی ایک اہم جماعت مل جائے جو آگے چل کر کام چلائیں گے۔

(۲) مستقل بنیادوں پر کام:۔

ہنگامی بنیاد پر کام کرنے کے علاوہ مستقل بنیادوں پر کام کرنے کی ضرورت ہے ہمارے مدارس عربیہ کے طلبہ میں بڑی استعداد ہے بدقسمتی سے ہماری غفلت اور بے توجہی سے یہ صلاحیتیں ضائع ہو رہی ہیں اس کے لئے ہمیں اپنے درس نظامی پر سنجیدگی سے غور کرنا ہوگا یہ الگ بات ہے کہ اس نصاب میں جو خوبیاں پائی جاتی ہیں ان کا تقاضا ہے کہ اس میں ترمیم نہ ہو بلکہ جوں کا توں رہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہمارے طلباء کی فراغت کے لئے آٹھ سال متعین ہوں تعلیم کا دورانیہ بڑھانا چاہیے اگر آج طالب علم آٹھ سال میں فارغ ہو جاتا ہے تو اس کی فراغت کے لئے بارہ سال ہونا چاہیے وقت بڑھانے اور نصاب میں عصری علوم کے اضافہ سے قدیم نصاب

متاثر نہیں ہوگا۔

میرے خیال میں اگر اس پر سنجیدگی سے غور ہو تو یہ کوئی مشکل نہیں کہ چند سالوں میں یہ کمی پوری ہو جائے سرکاری اطلاعات کے مطابق ہمارے ملک میں ایک لاکھ پچھتر ہزار مدارس عربیہ ہیں اگر ایک ہزار مدارس ایک ایک آدمی پیدا کریں تو پھر بھی سال میں یہیں ۱۷۵ سکالرز اور پختہ علماء میسر ہوں گے خدا کرے آج کے یہ بچے وقت کے رازی اور طوسی ثابت ہوں اس سے ایسی فعال شخصیتیں پیدا ہوں گی کہ وہ اسلامی سائنس کی جدید اصطلاح وضع کریں گے شاید اس سے مسلمان اپنا کھویا ہوا سرمایہ واپس حاصل کریں جو صلیبی جنگوں کے دوران دشمن نے ہم سے چھین کر غاصبانہ قبضہ جما رکھا ہے۔ یہی سائنس جو آج کل اللہ تعالیٰ کے وجود سے منکرین کے گھر کی لونڈی بنی ہوئی ہے مسلمان محنت کر کے اس کی اصطلاح کر سکتے ہیں کہ سائنسی تحقیق اللہ تعالیٰ کی ذات یا صفات سے انکار پر منتج ہونے کی بجائے

ربنا ما خلقت هذا باطلا سبحنك فقنا عذاب النار پر منتج ہو۔

فقہ اور چند ضروری گزارشات:۔

بنوں فقہی کانفرنس نے موجودہ دور کی علمی دنیا میں جس کمی کو محسوس کیا ہے اس کی ایک جھلک جناب ڈاکٹر رشید احمد جالندھری کی اس تحریر سے پیش کی جاتی ہے جس میں انہوں نے مولانا سید مناظر احسن گیلانی کے مقدمہ تدوین فقہ کے بارے میں لکھا۔ شاید کسی کو ان کے کسی نقطہ نظر سے اختلاف ہو لیکن علمی دنیا کے سامنے ان کی یہ تحریر ایک اہم احساس کی ترجمانی کر رہا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ دسویں صدی عیسوی کے ایک نامور صوفی ابوالقاسم قشیریؒ نے بزم صوفیہ کی ویرانی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا کہ "ہر چند کہ خیمے اب بھی موجود ہیں اور ان کے مکین بھی لیکن لیلیٰ کا چہرہ کہیں نظر نہیں آتا۔ افسوس! ہمارے زمانے میں اس قبیلہ عشاق کا جو اپنے پیچھے اپنے قدموں کے نشان چھوڑ گیا ہے۔ کوئی فرد باقی نہیں رہا(۱)

قشیری کے بعد بارہویں (۱۲) صدی کے ممتاز صوفی شیخ ابن عربیؒ نے اپنے عہد کی بربادی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ

"قشیری کے عہد میں لیلیٰ نہ سہی خیمے بھی باقی نہیں رہے" افسوس! یہی المیہ فقہ کے ساتھ بھی دہرایا گیا۔ فقہ اور فقیہ کے ساتھ عظیم الشان روایات وابستہ ہیں لیکن وقت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ آج یہ دونوں لفظ اپنی آب و تاب کھو بیٹھے۔ شاید الفاظ و معانی کو بھی بڑھاپے کی منزل سے گزرنا پڑتا ہے۔ ورنہ لفظ "فقیہ" صاحب بصیرت اور یکتائے روزگار کے لئے بولا جاتا تھا۔ وقت کا کوئی مسئلہ ایسا نہیں ہوتا تھا جسے فقیہ نہ سلجھا سکے اور حکومت کا کوئی منصب ایسا نہ تھا جسے فقیہ اعزاز نہ بخشے۔

لفظ "فقہ" غور و فکر اور حکمت و دانائی کے معنی میں بولا جاتا ہے اور جو لوگ بصیرت سے عاری ہیں گو گوشت پوست کے لحاظ سے تو انہیں آدمی ہی کہا جائے گا لیکن وہ آدمیت کے مقام سے فروتر ہی رہیں گے۔ قرآن مجید نے انہی لوگوں کے بارے میں کہا ہے کہ ان کے پاس دل تو ہیں، لیکن بصیرت سے کورے"

(۲) قرآن مجید نے ایک دوسرے مقام پر مسلمانوں کو دینی بصیرت کے حصول کی ترغیب دی ہے

(۳) سوال یہ ہے کہ دین کیا ہے؟ جواب میں نہایت ہی اختصار سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ دین کائنات میں انسان کے مقام کی ایسے ہی انسان اور خدا کے باہمی رشتے کی خبر دیتا ہے مزید یہ کہ دین زندگی کو ایک بلند نصب العین دیتا ہے۔

(۴) ان مسائل پر غور وفکر کرنے والے کو فلسفی، فقیہ اور عالم کے خطابات سے نوازا گیا ہے۔ یہ کہنا شاید مبالغہ نہ ہوگا کہ لفظ فلسفی، فقیہ، عالم اور صوفی قریب قریب ایک ہی معنی میں بولے جاتے تھے اور وہ تھے روح حقیقت سے نقاب اٹھانے والے پاکیزہ انسان، لیکن خدا جانے کہ وقت نے ان کے خلاف کیا سازش کی کہ فلسفہ کے چہرے پر تو خیر اب بھی تھوڑے بہت رونق باقی ہے، لیکن فقیہ کے عمامے، کو خشکی اور اجتماعی مسائل سے بے اعتنائی کا نشان قرار دے دیا گیا اور صوفی کے دامن پر رہبانیت، کام چوری اور جمود کے دھبے لگا دیئے گئے۔

واقعہ یہ ہے کہ اگر مسلمان ایک ملت اور زندہ قوم کی حیثیت سے اپنا لوہا منوانا چاہتے ہیں اور انسانی سوسائٹی میں صحت مند اخلاقی قدروں کو لے کر خدمت کا حوصلہ رکھتے ہیں تو پھر انہیں سنجیدگی سے از سر نو اپنے اجتماعی اور مروجہ مذہبی نظام کا جائزہ لینا چاہیے اور دیکھنا چاہیے کہ یہ نظام کہاں تک قرآن مجید کے پیغام رسول ﷺ کے اسوہ حسنہ اور عہد حاضر کے تقاضوں کا ساتھ دے رہا ہے۔ ان امور کا جائزہ لینا اس لیے بھی ضروری ہوگیا ہے کہ موجودہ وقت میں دنیا کا قانون جس نے آسمانی تعلیم سے اپنے رشتے توڑ لیے ہیں۔۔۔۔ اپنی پوری خوبیوں کے باوجود معاشرے کی بے چینی کو دور کرنے میں کامیاب نہیں رہا۔ مزید یہ کہ قانون کی دنیا میں تلاش حق کرنے والوں نے اس حقیقت کا سراغ پالیا ہے کہ اسلامی شریعت ایک ایسا قانون ہے جس سے تجاہل نہیں برتا جاسکتا۔ لیہ (Lehigh) میں ۱۹۳۸ء میں اہل قانون نے ایک بین الاقوامی اجتماع منعقد کیا جس میں مصری وفد نے بھی شرکت کی، اس اجتماع نے اپنے اختتام پر یہ بات تسلیم کر لی۔

۱) قانون کے تقابلی مطالعہ کے سرچشموں میں سے ایک سرچشمہ اسلامی شریعت بھی ہے۔

۲) شریعت اسلامیہ وقت کا ساتھ دے سکتی ہے اس میں داخلی طور پر قوت نمو موجود ہے۔

۳) شریعت اسلامیہ اپنی ذات میں ایک مستقل ادارہ ہے۔ (۵)

مصر کے اہل علم نے از سر نو حالیہ فقہی نظام کا جائزہ لیا۔ انہیں اس نتیجہ پر پہنچنے میں دیر نہیں لگی کہ آج کی فقہ دور انحطاط کی چند کتابوں کے مجموعہ کا نام ہے اس سے یہ توقع رکھنا کہ وہ اسلامی قانون کی ترجمان ہیں یا شریعت اسلامیہ کے قانونی پہلو کی نمائندہ ایک عبث توقع ہے۔ محمد خضری نے اس افسوس ناک صورت حال پر آنسو بہاتے ہوئے لکھا کہ "کیا یہ عجیب بات نہیں کہ جو کتابیں اسلام کے عہد عروج میں لکھی گئیں وہ تو یک قلم نظروں سے اوجھل ہیں اور یہ وہ کتابیں تھیں جو چوتھی اور پانچویں صدی ہجری میں لکھی گئیں۔۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہم امام محمد بن حسنؒ امام محمد بن ادریس شافعیؒ، امام مالک بن انسؒ اور دوسرے ائمہ کی کتابوں کو نہیں پڑھتے، لے دے کر خلیل کی مختصر زکریا انصاری کی منہج اور نسفی کی کنز ہمارے ہاتھوں میں ہے"

خضری نے صاف طور پر لکھا کہ فقہ اسلامی کی موجودہ تعلیم اور پڑھائی جانے والی کتابیں خود فقہ اسلامی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں(۶)

ہر چند کہ آج تک مسلم دنیا کے اکثر مقامات پر اسلامی قانون کا دائرہ کار صرف شخصی قوانین (Personal Laws) تک محدود ہے، دیوانی یا فوجداری مقدمات نپولین کوڈ کے تحت طے پا رہے ہیں۔(۸) لیکن یہ تمنا اہل فکر کے سینوں میں برابر مچل رہی ہے کہ ہمارے پورے قانون کی بنیاد شریعت اسلامیہ ہونی چاہیے۔ مصر کے ایک ممتاز قانون دان جناب عبدالرزاق سنہوری اس بارے میں لکھتے ہیں۔

''یہ امر کہ ہمارے قانون کی خشت اول اسلامی شریعت ہونی چاہیے۔ ایک عزیز ترین تمنا ہے جو سینوں میں دھڑک رہی ہے، لیکن قبل اس کے کہ یہ حقیقت کا روپ بدلے۔۔۔۔۔ شریعت اسلامیہ کی تحقیق کے لئے ایک زبردست علمی نشاۃ ثانیہ کی ضرورت ہے۔۔۔۔۔ اگر ہم شریعت اسلامیہ کی راہ ہموار کرنے میں کامیاب ہو گئے تو یہ امر ہمارے عظیم الشان ورثے، ہماری فقہ، ہماری عدالت اور ہماری قانون سازی میں آزادی و خود اعتمادی کی نئی روح پھونک دے گا۔ اس سے نہ صرف ہم دنیا کے سامنے ایک نئی روشنی کے ساتھ آئیں گے بلکہ قانون کی بین الاقوامی ثقافت کے بعض پہلوؤں کو نئی روشنی بھی عطا کر سکیں گے۔''

جب شریعت اسلامیہ کو قانون کی بنیاد قرار دینے کے بارے میں ممتاز اہل قانون اس انداز پر سوچنا شروع کر دیں تو پھر ہمیں حالات سے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ ہماری رائے یہ ہے کہ زندگی کے ہر شعبہ میں اسلامی قانون کو تدریجی طور پر نافذ کرنے کے لئے دو باتوں کا سنجیدگی سے جائزہ لینا ضروری ہے۔

الف) پاکستان کے مختلف حصوں میں سماجی یا شرعی نظام کا جائزہ لیا جائے کہ اس نظام کو کیوں کر اسلامی قانون کے مطابق بنایا جا سکتا ہے۔ مثلاً بلوچستان میں قبائلی نظام رائج ہے جس کی بنیاد عرف (Custom) پر ہے۔ سابق ریاست چترال میں ''شرعی نظام'' رائج تھا۔ مثلاً زکوٰۃ عشر لیا جاتا تھا، قاضی اور مفتی بھی تھے جو بستیوں میں قصاص کا بھی فیصلہ دیتے تھے۔ ریاست میں یتیم سرکاری مدارس تھے جس میں درس نظامی پڑھایا جاتا تھا اور اساتذہ کرام کی تنخواہیں سرکاری خزانے سے ادا کی جاتی تھیں، لیکن جب چترال کا الحاق پاکستان سے ہوا تو یہ ''شرعی نظام'' موقوف کر دیا گیا(۹) حالانکہ چاہیے تو یہ تھا کہ اس نظام کو جو ''شرع'' کے نام سے جاری تھا صحیح معنی میں شرعی بنانے کے لئے کوئی نیا قدم اٹھایا جاتا، لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔

اس مثال کے بیان کرنے سے مقصد یہ ہے کہ ملک کے سماجی اور اجتماعی حالات کا مطالعہ کیا جائے اور ان تمام امور پر ایک مفصل تحقیقی رپورٹ مرتب کی جائے۔ پھر اس کی روشنی میں سفارشات مرتب کی جائیں ورنہ صرف آئینی تقریروں سے اسلامی شریعت کبھی بھی نافذ نہ ہو سکے گی۔ کیا ہی اچھا ہو کہ چند محقق، ذہین اور اہل علم حضرات سیاسی شورشوں سے یک قلم الگ رہ کر ملک کے مختلف حصوں کے رسم رواج اور دستور و قانون کا تحقیقی مطالعہ کریں، اور اس کی روشنی میں اسلامی قانون کو بروئے کار لانے کے لئے

وسائل پر سوچ بچار کریں۔

ب) اموی اور عباسی دور کا بھی جائزہ لیا جائے کہ اسلامی قانون زندگی کے کس کس شعبے میں جاری تھا۔ کیونکہ یہ کہنا خالی از حقیقت نہ ہوگا۔ کہ مسلمانوں کے عہد عروج میں حکمران طبقہ نے اسلامی قانون کو پوری طرح سے نہیں اپنایا، سیاست و اقتدار کا شعبہ ہمیشہ قانون کی قلمرو سے باہر رہا فقہ اسلامی نے طہارت نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، نکاح اور طلاق کے مسائل کی جزئیات کا اس حد تک احاطہ کیا کہ انسان داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا لیکن سلاطین، وزراء، حکام اور فوجی کمانڈروں نے لوٹ کھسوٹ کا جو بازار گرم کر رکھا تھا اور دار عیش دینے کے لئے جو جو رنگ رلیاں منائی جاتی تھیں یا اپنے اخراجات کو پورا کرنے کے لئے اپنے ہی شریک اقتدار ساتھیوں کو لوٹ لیا جاتا تھا یا خود سلاطین و خلفاء ہی کو الگ کر دیا جاتا تھا، غرض یہ کہ اس استبدادی اور شاہی نظام کو جو ہماری تاریخ کا ایک المناک باب ہے قانون کے دائرے میں لانے کے لئے ہماری فقہ نے خاموشی اختیار کی۔

تاریخ کا طالب علم اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ بادشاہوں کے درباروں میں اور وزراء کے محلات کے پاس اسلامی قانون کو پھٹکنے نہیں دیا جاتا تھا۔ یہاں تعزیرات و قصاص بے بس تھے، اس اندوہ ناک صورت حال پر جو صدیوں سے ہمارے معاشرے کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے ہے کبھی کبھی سنجیدگی سے غور نہیں کیا گیا کہ آخر ان مشکلات پر قابو کیسے پایا جائے اور اہل اقتدار پر قانون کی حکمرانی قائم کرنے کے لئے کن کن وسائل کا سہارا لیا جائے؟ اس لیے آج جو لوگ پاکستان میں خوش اعتقادی سے یہ کہہ دیتے ہیں کہ مسلم عہد میں اسلامی قانون زندگی کے ہر شعبہ میں جاری و ساری تھا۔ وہ حقائق کی دنیا میں نہیں رہتے۔ تاریخ طبری، کامل اور مسعودی کے اوراق الٹتے جایئے اور دیکھئے کہ کیا اموی و عباسی سلاطین کی زندگیاں (دو چار کو چھوڑ کر) قانون کے سامنے سرنگوں نظر آتی ہیں۔ سلاطین و خلفاء کے عزل و نصب کا سوال ہو یا وزراء و حکام کی باہمی چپقلش کا مسئلہ ان سب کا فیصلہ قانون نہیں، تلوار کرتی تھی خود ہمارے ہاں مغل دربار کے فیصلے جن کا تعلق حاکم سے ہوتا تلوار نے کیے ہیں۔

حاصل کلام یہ ہے کہ آج اسلامی قانون کی اہمیت کو جاننے اور عملی جامہ پہنانے کے لیے جہاں پاکستانی معاشرے کے رسم و رواج اور مروجہ قوانین کا جائزہ لینا ضروری ہے وہاں اسلام کے صدر اول میں اس قانون کی صحیح پوزیشن کا جائزہ بھی از بس ضروری ہے۔ نیز یہ کہ موجودہ دنیا میں جب کہ مغرب کا قانون اپنی سیادت کا دعویدار ہے قانون کا تقابلی مطالعہ نہ صرف اسلامی قانون کی راہ ہموار کرنے میں مددو مددگار ثابت ہوگا بلکہ اسلامی قانون کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ بھی لگایا جا سکے گا۔ اس لئے یہ کہنا بھی جا نہ ہوگا کے دنیا اور اپنے وقت کا محاسبہ کئے بغیر جو لوگ اسلامی قانون کو عملی طور پر دیکھنے کی تمنا رکھتے ہیں افسوس وہ تمناؤں میں الجھائے گئے ہیں۔

ہمیں اپنے قانون دان دوستوں اور محترم علماء کرام سے امید ہے کہ ان کی مشترکہ کوششوں سے اسلامی قانون کا ایک ایسا عمدہ مجموعہ مرتب ہو سکتا ہے جو ہماری تاریک راہوں کو روشن کر سکتا ہے یہ کوئی ایسی چیز نہیں جس کا حصول ناممکن ہو۔ ہم ہی نہیں بلکہ پوری انسانی جماعت سماجی انصاف کے قیام کے لیے نئے نئے تجربے کر رہی ہے جن سے ہم فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ کیونکہ جدید قانون میں جو

چیزیں اسلام کے بنیادی اصولوں سے متصادم نہیں ان کو اختیار کرنے میں بشرطیکہ ہمارے مفاد میں ہوں کسی عالم نے اعتراض نہیں کیا۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اسلام اور جدید قانون میں بنیادی فرق یہ ہے کہ ہمارے قانون کی بنیاد اخلاق اقتدار پر ہے جن کا سرچشمہ وحی ہے۔ سوسائٹی کا مفاد نہیں۔ دراصل ہم اس اصول کو نہیں مانتے جو یہ کہتا ہے کہ جو چیز سوسائٹی کے لیے سودمند ہے اچھی ہے اور اس امر کا فیصلہ سوسائٹی کرتی ہے ہم اس مفروضے کو نہیں مانتے کیونکہ یہ عین ممکن ہے کہ ایک چیز جدید قانون کی نظر میں مفید اور اچھی ہو، لیکن وحی کی نظر میں نقصان دہ اور برائی، مثلاً سود مغربی کی نگاہ میں اچھائی ہے لیکن اسلام نے اسے برائی شمار کیا ہے یا یہ کہ مرد عورت کے آزاد جنسی تعلقات، جدید قانون کی نگاہ میں جائز ہیں بشرطیکہ ان کی بنیاد جبر پر نہ ہو لیکن اسلام نے اسے برائی سے تعبیر کیا ہے(۱۱) یہاں یہ بات بھی پیش نظر رکھنی چاہیے کہ اشیاء کے حسن وقبح کی ترازو جن لوگوں کے ہاتھ میں دے دی گئی ہے وہ کون لوگ ہیں ؟ ہوسکتا ہے کہ انہوں نے جن چیزوں کو سوسائٹی کے لئے مفید قرار دیا ہے وہ حقیقت میں سوسائٹی کے لیے نقصان دہ ہوں۔ آج ساری دنیا میں سرمایہ داروں کے خلاف بغاوت ہے اور اسے ایک برائی قرار دیا گیا ہے لیکن اسی ''سرمایہ داری'' کو صدیوں تک سوسائٹی پر مسلط کیا گیا اور قانون کی اسے حمایت حاصل رہی۔ جن لوگوں نے سرمایہ داری کو سوسائٹی کے لیے مفید قرار دیا تھا آج وہ وقت کی نظر میں سب سے بڑے مجرم شمار کیے جاتے ہیں غرض یہ کہ ہمیں مارٹن بوبر (Martin Buber) کے اس قول سے کاملا اتفاق ہے کہ تمام اشیاء کے (حسن وقبح) کا پیمانہ خدا ہے۔ انسان نہیں (Man is not measure of all things)

ان مثالوں سے اس بات کا اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اسلامی قانون اور جدید قانون میں ٹکراؤ کا بنیادی سبب کیا ہے؟ قانون کا یہ تقابلی مطالعہ یقیناً ہمارے سامنے برائی کو روکنے کی نئی نئی راہیں کھول دے گا نیز یہ کہ اس سے نئے مسائل کو سمجھنے میں مدد ملی گی۔ نئے مسائل کو سمجھے بغیر شاید ہی کوئی ''فقیہ'' کے معزز خطاب سے نوازا جائے۔ امام غزالیؒ نے کہا تھا کہ دنیاوی باتوں میں انسانوں کے مفاد کا خیال رکھنا فقیہ کے فرائض میں ہے اور جو لوگ اپنے عہد کے مزاج سے ناآشنا اور اپنے وقت کے مسائل سے ناواقف ہیں وہ شیخ عبدہ کی رائے میں عالم کہلانے کے مستحق نہیں ہیں۔ خواہ وہ دینی علوم میں کتنے ہی طاق کیوں نہ ہوں۔ چنانچہ وقت کے پیدا کردہ مسائل کا حل وہی لوگ کرسکیں گے۔ جنہیں خدا نے علم وعشق اور عقل ودانش سے نوازا ہے کیونکہ ان مسائل کو حل کرکے ہی اسلامی قانون کے نفاذ کی راہ تیار کی جاسکتی ہے۔

غرض یہ کہ اس قسم کے مسائل میں جو اسلامی انصاف کی روشنی میں حل طلب ہیں ہماری سوسائٹی صدیوں سے ایسے بلند نظر فقیہوں کی راہ تک رہی ہے جو اپنی مسلسل کاوشوں سے ہمیں ایسا قانون دیں جن میں ان کی جان ومال، عزت اور محنت محفوظ ہو۔ انہی لوگوں سے ہمیں یہ توقع ہے کہ وہ ہماری سوسائٹی کے چہرے سے مکر ونفاق کا نقاب الٹنے میں اپنا تاریخی کردار ادا کریں گے اور اس طریق سے اقبال وجناح کی سرزمین کو اسلامی قانون کی جلوہ گاہ بنا کردم لیں گے۔

برصغیر پاک وہند میں برطانوی راج نے اپنے مفاد کے لیے جو سیاسی، قانونی اور تعلیمی نظام رائج کیا اس نے یہاں کے عام

باشندوں خاص کر مسلمانوں کو اخلاقی اور روحانی اقدار سے بہت پیچھے دھکیل دیا جس کا ایک مظاہرہ یہ تھا کہ اسلامی قانون کو پرسنل لاء تک محدود کر دیا گیا اور اس پر بھی طرفہ تماشہ یہ کہ نجی معاشرت سے متعلق ''قوانین بھی اسلامی شریعت کی روح سے یک قلم خالی تھے۔ مسلمانوں کی ایک جماعت نے مسلسل یا کوشش کی کہ مسلمان کم از کم اپنی انفرادی زندگی ہی میں شریعت کی پیروی کریں اور نکاح، طلاق، میراث اور اوقات سے متعلق پیش آمدہ مشکلات کا حل اسلام کی صحیح تعلیم میں تلاش کریں۔ سرکاری سطح پر عبداللہ کا شریعت بل اور محمد احمد کاظمی کا خلع بل (مرکزی اسمبلی میں) انہی کوشش کی ایک کڑی تھا۔ (۱۲) انفرادی طور پر علماء کرام نے اسلامی فقہ پر قلم اٹھایا اور بتایا کہ اسلامی فقہ جسے آج ہمارے ہاں کا ایک گروہ دفتر بے معنی قرار دیتا ہے۔ ہمارے تمدن کا ایک عظیم الشان ورثہ ہے۔ واقع یہ ہے کہ کسی تمدن کی قدر و قیمت اور حسن وخوبی کا اندازہ اس کے قانون ہی سے لگایا جا سکتا ہے کہ کہاں تک اس تمدن کا قانون انسانی وقار اور آزادی کی ضمانت دیتا ہے۔ اسلامی فقہ نے اپنے پہلے دور میں انسانی وقار اور آزادی کی حفاظت کے لئے جو بحثیں کی ہیں ان سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اسلام انسان کو کس اونچے مقام پر دیکھنا چاہتا ہے۔ نیز یہ کہ اسلام کی نگاہ میں آزادی کا تصور کس قدر پاکیزہ ہے۔ لیکن ہمارے دور انحطاط میں انسانی وقار کی خود مسلمانوں کے ہاتھ سے جو مٹی پلید ہوئی وہ بھی ہماری تاریخ کا ایک سیاہ باب ہے۔ یہی باب جس کی طرف ہم نے بار بار اشارہ کیا ہے کہ آخر ایسا کیوں ہوا۔ قانون اور سوسائٹی کا مقدس رشتہ کیوں ٹوٹا؟ اور اب اس رشتے کو کیسے جوڑا جائے؟ اہل فکر کی ایک قلیل جماعت نے مقدور بھر ان اسباب کی نشان دہی کی۔ مذہبی امور میں جمود و تصلب اور تشدد و غلو پر عہد جدید میں سب سے پہلے شاہ ولی اللہ نے الانصاف اور عقد الجید میں لکھا اور بتایا کہ اسلامی فقہ کی امتیازی شان کیا ہے؟ اختلاف رائے کی جو فقہاء کے ہاں پایا جاتا ہے صحیح صورت حال کیا ہے؟ یا زندگی کی مشکلات پر قابو پانے کے لئے اجتہاد نے کیا کام کیا اور اجتہاد و تقلید کی صحیح پوزیشن کیا ہے؟ (ڈاکٹر رشید احمد جالندھری)

نوٹ: مذکورہ مضمون کو مقدمہ تدوین فقہ سے مختصر کر کے ماخوذ کیا گیا ہے تا کہ علمی دنیا کو فائدہ عام ہو اور اس سلسلہ میں ہم مکتبہ رشیدیہ لاہور کے شکر گزار ہیں۔